نبی کریم ﷺ کا منہج اصلاح

(مکی دور کے تناظر میں)

Methodic reforms of Prophet (S.A.W)

(in the view of Makk□ period)

سید محمد شاہد ترمذی*

ABSTRACT

Before the prophecy of Prophet (S.A.W) the overall state of Arabs was so spoilt that even it was impossible for pedagogue and rectifier to show them the right path because it was not merely the matter of rectification of faith or preaching of right path neither to make them get rid of false beliefs nor to ameliorate the society. For the fulfilment of such type of rectification the preachers and guides are always there in the society and the reparation continues or carries on.

The real muddle was to eliminate the arrogance and detrimental idolism which was so incessant generation to generation in the long run that the preaching and teaching of Prophet and the endeavor of guides were ineffective for them. It was the need of time to establish such type of shelter in which people of world could refuge in it. The remedy of this issue to bring into existence such type of human who was entirely different from the primitive human being. So Holy prophet (S.A.W) came as reformist.

There are many golden aspects of prophet's (S.A.W) reformation in a society, *Makk□* life is also one of them. It is not only changed and revolutionized the whole of the human history but also changed political, social and moral scenario of world. Methodology which our Holy prophet adopted it was the first Methodology that respected and valued human wisdom along with being on right path. In this article the same view point has been discussed. The following are the main points:

1. Preacher's conformity in words and deeds.
2. Clear mandate to set the target.
3. Perseverance to achieve the set goal.
4. The best policy for the betterment of society.
5. The key points for the leadership.

Keywords: *Prophet, Makkah, society, reforms, preacher.*

* لیکچرار، شعبہ علوم اسلامیہ، نمل یونیورسٹی، اسلام آباد

بعثت نبوی سے پہلے عربوں کی مجموعی حالت اس حد تک بگڑ چکی تھی اور انسانیت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ ان کی اصلاح عام قسم کے مصلحین اور معلمین کے بس کی بات نہ تھی کیونکہ معاملہ نہ تو کسی ایک عقیدے کی اصلاح کا تھا نہ کسی عبادت کی ترغیب کا، نہ ان کی کوئی بری عادت چھڑوانے کا تھا اور نہ کسی ایک معاشرے کی اصلاح کا تھا، ایسے کاموں کی تکمیل کے لیے تو ہر جگہ اور ہر زمانے میں مصلحین اور معلمین موجود رہتے ہیں اور یہ کام تسلسل سے ہوتا رہتا ہے۔

اصل مسئلہ اس جاہلیت اور تباہ کن بت پرستی کے خاتمے کا تھا جو نسل در نسل بڑھتی ہوئی ایک طویل عرصے کے بعد اس قدر مضبوط اور عام ہو چکی تھی کہ انبیا اور رسولوں کی تعلیمات دب کر رہ گئی تھیں اور مصلحین و معلمین کی جدوجہد بے اثر بن چکی تھی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ایک ایسی مضبوط، عالی شان، وسیع و عریض عمارت قائم کی جائے جس میں اقوام عالم پناہ لے سکیں اور وہ ساری دنیا کو اپنی وسعتوں میں سمیٹ لے۔ اس دور کا اہم قضیہ یہ تھا کہ ایک نئے انسان کو وجود میں لایا جائے جو ہر لحاظ سے قدیم انسان سے مختلف ہو۔

منہج کا مفہوم

ابن فارس رحمۃ اللہ علیہ نے منہج کا لغوی معنی بیان کرتے ہوئے کہا: کہ نون ھاء اور جیم دو مختلف اَصل ہیں: پہلا: "النَّهْجُ"راستہ،اور "وَنَهَجَ لِي الْأَمْرَ: أَوْضَحَهُ"،نہج لامر یعنی میرے لیے معاملہ واضح ہو گیا، "وَالْجَمْعُ الْمَنَاهِجُ "اس کی جمع منہاج ہے۔[۱]

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ منہج کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: "الْمَنْهَجُ" کا معنی واضح راستہ اور "الْمِنْهَاجُ الطَّرِيقُ الْوَاضِحُ"کا معنی واضح کرنا اور اسی طرح حدیث مبارکہ میں ہے "أَنَّهُ رَأَى رَجُلًا يَنْهَجُ"(اس نے دیکھا ایک آدمی کو جو چلتا تھا)۔[۲]

منہج کے بارے میں امام القرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

’’الشرعة بالشريعة، والمنهاج فإنّ أصله : الطريقُ البيِّن الواضح، يقال منه: قال الراجز: مَنْ يكُ فِي شَكٍّ فَهذَا فَلْجُ
مَاءٌ رَوَاءٌ وَطَرِيقٌ نَهْجُ
معنى الكلام : "لكل قوم منكم جعلنا طريقًا إلى الحق يؤمُّه، وسبيلا واضحًا يعمل به"[۱]

---

(۱) احمد بن فارس، معجم مقاییس اللغۃ، کتاب النون، محقق: عبد السلام محمد ھارون، دار الفکر،۱۹۷۹ء،۵/۳۶۱

(۲) الرازی، محمد بن ابی بکر، مختار الصحاح، محقق: یوسف الشیخ محمد، المکتبۃ العصریۃ، بیروت، لبنان،۱۹۹۹ء، ص:۶۸۱

شریعت کے تحت چلنا اور منہاج اس کی اصل واضح بیان ہے، واضح راستہ

ترجمہ: حق کی طرف قصد کرنے کے لیے تم میں سے ہر قوم کے لیے ایک راستہ مقرر کیا ہے اور واضح راستہ جس کے ساتھ وہ عمل کرتا ہے۔

وورد في القرآن الكريم:﴿ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا﴾ (۲)

ترجمہ: جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ہم نے ہر ایک کے لیے راستہ اور طریقہ بنایا ہے۔

عبد الرزاق عفیفی منہج کا اصطلاحی مفہوم بیان کرتے ہیں:

"هو مجموعة الركائز والأسس المهمة التي توضح مسلك الفرد أو المجتمع أو الأمة لتحقيق الآثار التي يصبو إليها كل منهم" (۳)

ترجمہ: اہم بنیادیں اور خزانوں کے مجموعے کا نام ہے جو فرد اور معاشرے یا امۃ کے مسلک کو واضح کرتی ہیں، آثار کی تحقیق کے لیے جس کی طرف ان میں ہر ایک کا پہنچنا ہے۔

اصلاح کا لغوی معنی

ابن منظور رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: **"الإصلاح: نَقِيضُ الإفساد"** لفظ اصلاح فساد کا متضاد ہے، **"وَرَجُلٌ صَالِحٌ فِي نَفْسِهِ مِنْ قَوْمٍ صُلَحاء ومُصْلِح فِي أَعماله وأُموره"** صلاح کا لفظ اس صالح شخص کے لیے بولا جاتا ہے، جو اپنی قوم کے شرفاء میں سے ہو اور اپنے امور کو صحیح طریقے سے ادا کرتا ہو، **" وَهَذَا الشَّيْءُ يَصْلُح لَكَ"** یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے، جب کوئی شخص اصلاح کی غرض سے تمھارے پاس آتا ہے (۴)۔

ابراہیم مصطفی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں: لفظ "صلح" بات تفاعل یعنی تصالح سے ہے یعنی قوم کی آپس میں باہم صلح کروا دینا۔ اسی طرح "صلح" امن کا مترادف ہے۔ اسی طرح "صلح" صلح یصلح صلاحاً وصلوحا سے ماخوذ ہے اس اعتبار سے اس کا معنی فساد کو ختم کرنا ہے یعنی اس سے وہ چیز جو فائدہ مند اور مناسب ہے (اپنی اصل پر آجائے گی) اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اسی کو اس کی اصل پر لایا جا چکا ہے۔ (۵)

---

(۱) القرطبی، محمد بن احمد، تفسیر القرطبی، محقق: احمد محمد شاکر، مؤسسۃ الرسالۃ، ۲۰۰۰ء، ۳/۵۷

(۲) سورۃ المائدہ: ۵/۴۸

(۳) عفیفی، عبد الرزاق، معالم منهجه الأصولی-مجلۃ البحوث الاسلامیۃ: ۵۸-ص: ۳۰۰

(۴) ابن منظور، محمد بن مکرم، لسان العرب، دار صادر، بیروت، ۱۴۱۴ھ، فصل الصاد ۲/۵۱۷

(۵) ابراہیم مصطفی، المعجم الوسیط، دار الدعوۃ، استنبول، ۱۹۸۹ء، باب الصاد، ۱/۵۲۰

امام الرازی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں: اسی سے "استصلح الشیء" اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی چیز کو درست کر دیا جائے یا وہ درستگی کی طلب گار ہو، اور وہ اپنے فرائض کی درستگی پر گامزن ہو۔ اور صلاح استقامت اور عیب سے مبراء ہونا ہے اور صلح جھگڑے کو مٹانا ہے۔[۱]

اصلاح کی اصطلاحی تعریف

خلیفہ عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: " بندوں کی اصلاح امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے اور معاش کی اصلاح اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں مضمر ہے، اور یہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی، اسی وجہ سے اس امت کو بہترین امت قرار دیا ہے۔"[۲]

امام الرازی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

"الصلاح عبارة عن الإتيان بما ينبغي والإحتراز عمّا ينبغي"[۳]

ترجمہ: صلاح عبارت ہے ہر اس کام کے کرنے کا جس کو کرنا چاہیے اور ہر اس کام سے بچنے کا جس سے بچنا لازم ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے لاتعداد پہلو ہیں ان میں سے ایک مکی زندگی میں اصلاح معاشرہ ہے جس کے ذریعے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نوع انسان کی پوری تاریخ کو نہ صرف بدل دیا بلکے دنیا کا سیاسی، سماجی اور اخلاقی منظر تبدیل کر دیا۔ اس کے لیے جو منہج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں اختیار کیا وہ پہلا منہج تھا جس نے انسانی عقل کا احترام کیا اور اس کے ساتھ سچائی اور حق پر مبنی بات کی۔ اس مقالہ میں اسی منہج اصلاح کو بیان کیا گیا جو کہ فرد اور جماعت کے تعلق کے لیے بہترین اور جس کے نتائج ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ یہ منہج چھ نکات پر مشتمل ہے۔

۱۔ قول میں ثقاہت	۲۔ تعین ہدف میں واضح منشور
۳۔ حصول ہدف کے لیے صبر و تحمل	۴۔ بہترین منہج کا انتخاب
۵۔ قیادت کی تیاری	۶۔ معاشرتی اقدار کا لحاظ

(۱) مختار الصحاح، ص:۳۶۷

(۲) التونسی، خلیفۃ عبد اللہ، جولۃ فی ذات المسلم، مکتبۃ البیان_الکویت، ط۱، ۱۹۸۹ء، ص:۳۲۳

(۳) الالوسی، شہاب الدین محمود، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع الثانی، ادارہ الطباعۃ المصطفائیۃ بالھند، ط۱، ۱۴۱ھ، ۴/۲۰۳

۱- قول میں ثقاہت

رسول اللہ ﷺ چاہتے تھے کہ اس سے پہلے کہ ان کو اس بات کی دعوت دی جائے کہ میں تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں اور مجھ پر وحی کی جاتی ہے یا ان کو ان کے مستقبل کے بارے میں خبر دار کیا جائے ان سے اس بات کی تصدیق کروائی کہ کہنے والے کی ان لوگوں کی نگاہ میں کیا حیثیت ہے اسی لیے آپ نے پہلے ان سے اپنے بارے میں تصدیق کروائی جس کا انہوں نے برملا اظہار کیا کہ ہم نے آپ کو ہمیشہ سچ بولتے پایا ہے۔ اس لیے کہ داعی کا ثقہ ہونا اس کی دعوت کے لیے پہلی اور بنیادی شرط ہے اور یہ دو اعتبار سے ہے۔

۱۔ داعی کا اپنی ذات میں ثقہ ہونا

۲۔ داعی کا معاشرے میں ثقہ ہونا

جب کہ جو بات داعی کے اپنے نفس سے متعلق ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس سے متعلق بہترین تعبیر پیش کی۔

"اللہ کی قسم اگر یہ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں تب بھی میں (اللہ کی طرف بلانا) نہیں چھوڑوں گا۔ یہاں تک کہ اللہ اس امر کو واضح کر دے یا اس میں ہلاک کر دے جو میں نے چھوڑا"[(۱)]

رسول اللہ ﷺ نے جس ماحول میں یہ کلمات ادا کیے اس زمان ومکاں کے تمام لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف ہلہ بول دیا تھا لیکن آپ ﷺ کی ذات معاشرے میں منہج کے اعتبار سے ان تمام لوگوں سے زیادہ وزنی حیثیت رکھتی تھی۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لا يَعْلَمُونَ﴾[(۲)]

ترجمہ: اور عزت صرف اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے لیے ہے لیکن منافق نہیں جانتے۔

جاہلی معاشرے کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ اچھی صفات اور رسم رواج سے عاری ہوتا ہے، بہادری اور شعری تفاخر کا فکر و ثقافت پر رنگ چھایا رہا جس بنا پر اس معاشرے نے سرکشی اپنائے رکھی۔ اسی لیے امانت و دیانت کا ان کے معاملات دنیا میں کوئی عمل دخل نظر نہیں آتا تھا، ایسے معاشرے میں جہاں اخلاقیات کا جنازہ نکل ہوا تھا، آپ ﷺ نے اپنے اخلاق کا وہ نمونہ پیش کیا کہ جس کی بنیاد پر اسی معاشرے نے آپ ﷺ کو صادق وامین کے لقب جانا۔

---

(۱) ابن ہشام، عبد الملک بن ہشام، السیرۃ النبویہ، مکتبۃ مصطفی البابی، مصر، ط ۱، ۱۳۷۵ھ، ۱/ ۲۶۶

(۲) سورۃ المنافقون: ۶۳/ ۸

ابن ہشام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش مکہ وحی کے نازل ہونے سے پہلے امین کہا کرتے تھے"۔[۱]

ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقینا اس لقب کے ہی حق دار تھے کیونکہ وہ امین تھے اللہ کی وحی اور دین کے، وہ امین تھے آسمان وزمین کے اسی لیے ان کو نبوت سے پہلے امین کہا گیا"۔[۲]

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

"ابو جہل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچائی اور امانت میں نہیں جھٹلاتے لیکن آپ کو اس قرآن مجید پر جھٹلاتے ہیں جو وہ لائے ہیں"۔[۳]

((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَاقَالَ:صَعِدَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الصَّفَا، فَجَعَلَ يُنَادِي: «يَا بَنِي فِهْرٍ، يَا بَنِي عَدِيٍّ» - لِبُطُونِ قُرَيْشٍ - حَتَّى اجْتَمَعُوا فَجَعَلَ الرَّجُلُ إِذَا لَمْ يَسْتَطِعْ أَنْ يَخْرُجَ أَرْسَلَ رَسُولًا لِيَنْظُرَ مَا هُوَ، فَجَاءَ أَبُو لَهَبٍ وَقُرَيْشٌ))[۴]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے قبیلہ قریش والوں کو دعوت دی اور ان کو ان کے ناموں سے پکارا یا بنی فہر! یا بنی عدی جب سب لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے فرمایا: کیا تم اس بات پر یقین کرو گے اگر میں تم سے کہوں کہ ایک لشکر اس وادی میں ہے جو تم پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہے کیا تم اس بات کو مانو گے تو سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم نے کبھی آپ سے جھوٹ نہیں سنا آپ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔

عتبہ بن ربیعۃ نے کہا:

"پھر قریش کو مخاطب کر کے کہنے لگا خوب اچھی طرح جان لو اللہ کی قسم وہ جھوٹ نہیں بولتا میں نے تم پر عذاب میں تخفیف کر دی ہے تم میری بات مانو اور اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو"۔[۵]

---

(۱) السیرۃ النبویہ، ابن ہشام، ۱/۱۹۸

(۲) ابن قیم، محمد بن أبی بکر، زاد المعاد فی ھدی خیر العباد، شعیب الأرناؤوط وعبد القادر، دار الرسالۃ، ۱۳۹۹ھ، ۱/۲۳

(۳) الیحصبی، عیاض بن موسی، الشفاء بتعریف حقوق المصطفی، دار الفیحاء–عمان، ۱/۱۷۸-۱۷۹

(۴) البخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، باب: وانذر عشیرتک الاقربین، محقق: محمد زھیر بن ناصر، دار طوق النجاۃ، ط ۱، ۱۴۲۲ھ حدیث ۴۷۷۰، ۶/۱۱۱

(۵) ابن کثیر، اسماعیل بن عمر، السیرۃ النبویہ، دار الفکر_بیروت، ط ۲، ۱۳۹۸ھ، ۱/۵۰۳

رسول اللہ ﷺ نے یہاں دعوت دینے سے پہلے معاشرے میں رہنے والے لوگوں سے اپنے کردار کی تصدیق کروائی جو کہ داعی کے ثقہ ہونے کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

رسول اللہ ﷺ چاہتے تھے کہ اس سے پہلے کہ ان کو اس بات کی دعوت دی جائے کہ میں تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں اور مجھ پر وحی کی جاتی ہے یا ان کو ان کے مستقبل کے بارے میں خبر دار کیا جائے ان سے اس بات کی تصدیق کروائی کہ انہیں جو بھی دعوت دی جارہی ہے وہ محض نظریات کی بنیاد پر نہیں ہے اور کہنے والے کی ان لوگوں کی نگاہ میں کیا حیثیت ہے اسی لیے آپ نے پہلے ان سے اپنے بارے میں تصدیق کروائی جس کا انہوں نے برملا اظہار کیا کہ ہم نے آپ کو ہمیشہ سچ بولتے پایا ہے۔

> "نضر بن حارث رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا مخالف تھا اور دعوت اسلامی کو روکنے کے لیے بہت سارے حربے آزمائے لیکن اس کے باوجود وہ اس حقیقت کا انکار نہ کرسکا کہ تم میں ایک نوجوان ایسا ہے جو بات میں سچا اور امانتوں کا پاس کرنے والا، جب تم اس کو دیکھو اور جو وہ دعوت دے تو تم یہ کہو کہ یہ جادوگر ہے"۔ (۱)

عصر حاضر میں داعی کی پہچان درج ذیل امور سے ہو:

۱. معاشرے میں اس کی ساکھ یہ ہو کہ اخلاق فاضلہ کا مالک ہو۔

۲. تمام لوگوں سے اللہ کے لیے محبت کرتا ہو۔

۳. اسے اپنے رب اور ذات پر پورا بھروسہ ہو۔

۴. اسے اپنی دعوت کے صحیح اور اس کی کامیابی پر پورا یقین ہو۔

یہ وہ معاملات ہیں جن کو عصر حاضر کے تمام قائد جو کسی بھی طریقہ سے معاشرے کی اصلاح کا کام کر رہے ہیں ملحوظ خاطر رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن نبی پاک ﷺ کے منہج میں یہ باتیں صرف نظریاتی نہیں بلکہ عملی شکل میں نظر آتی ہیں اور یہی آپ ﷺ کی اصلاحی تحریک کا امتیاز ہے۔

۲-تعین ہدف میں واضح منشور:

اسلام نے معاشرے کی اصلاح کا جو اصول اور قاعدہ بتایا ہے اس میں مکمل وضاحت سے کام لیا گیا ہے۔ اور اس کی بہترین مثال حضرت محمد ﷺ کی اپنی ۲۳ سالہ زندگی ہے۔ جن میں سے ۱۳ سال مکی زندگی کے ہیں، ان سالوں میں نبی ﷺ نے واضح اور جلی اسلوب کو اختیار کیا۔ ہدف کے واضح ہونے سے مراد قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ

(۱) ابن حجر، احمد بن علی، فتح الباری، محقق محمد فواد عبد الباقی، دار المعرفۃ، بیروت، ۱۳۷۹ھ، ۱۰/ ۱۱۹

کی سنتِ مطہرہ سے فائدہ اٹھانا اور اہداف کو سمجھنا۔ اسی لیے ہدف کو متعین اور منطقی اعتبار سے بہترین اسالیب کا اختیار کرنا۔ اس بات کے خصوصی خیال کے ساتھ کہ وہ جدید، دلچسپ، واضح اور بیک وقت تمام لوگوں کے ضروریات کو پورا کرسکے۔

رسول اللہ ﷺ نے معاشرے کی اصلاح کے لیے ہدف کو سب سے پہلے ان کے سامنے واضح کیا اور اس میں کسی طرح کی گنجائش نہیں رکھی۔ قرآن مجید میں اس انداز میں اللہ نے ہدف بیان کیا۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ، لا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ، وَلا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ، وَلا أَنَا عَابِدٌ مَا عَبَدْتُمْ، وَلا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ، لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ﴾[1]

ترجمہ: کہہ دیجیے اے کافرو! جن کو تم پوجتے ہو ان کو میں نہیں پوجتا۔ اور جس کی میں عبادت کرتا ہوں اس کی تم عبادت نہیں کرتے۔ اور جن کی پرستش تم کرتے ہو ان کی میں پرستش کرنے والا نہیں۔ اور نہ تم اس کی بندگی کرنے والے ہو جس کی میں بندگی کرتا ہوں۔ تم اپنے دین پر میں اپنے دین پر

یہاں اللہ تعالی نے واضح انداز میں وضاحت کی کہ عبادت صرف اسی کی صحیح ہوگی جس کی محمد ﷺ کرتے ہیں اس کے علاوہ تمام کی عبادت باطل ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ اسی رب کی طرف ان کو پکار رہے ہیں جن کو وہ لوگ پکارتے ہیں لیکن ان کا انداز اللہ کے ساتھ شرک کا ہے۔

اسی ہدف کو اور واضح کرنے کے لیے آپ ﷺ نے ان آیات کی تلاوت سے کی۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ إِنَّ صَلاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، لا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ﴾[2]

ترجمہ: کہہ دو کہ میری نماز اور میری عبادت اور میری قربانی اور میرا جینا سب اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے۔

جبکہ کوئی بھی تحریک یا جماعت اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہے جب وہ واضح اور روشن منشور و پالیسی رکھتی۔ اسی لیے آج کے اس دور جدید میں پارٹیاں، اصلاحی جماعتیں اپنے اہداف کو متعین کرنے اور لوگوں کے سامنے واضح کرنے سے گریزاں ہیں۔

---

(۱) سورۃ الکافرون:۱۰۹/ ۱۔۶

(۲) سورۃ الانعام:۶/ ۱۶۲

رسول اللہ ﷺ نے اپنے کاشانہ اقدس پر تمام قبیلے والوں کو جمع کیا اور ان کو امان اور سکون کی ضمانت کے ساتھ ساتھ توحید، ایمان، روز حشر، جنت و جہنم کی دعوت دی، اور یہ صرف اللہ کے حکم سے تھا اور اس پر ان سے کسی بھی طرح کا کوئی فائدہ مطلوب نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے اس بات کو بڑے اچھے انداز سے واضح کیا۔

"میں تم سے مال، عزت، بادشاہت، کا مطالبہ نہیں کروں گا، بلکہ مجھے تو اللہ نے تمھاری طرف رسول بنا کر مبعوث کیا ہے، اور کتاب کو نازل کیا ہے تاکہ میں تم کو حکم دوں اور تمہارے لیے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنایا گیا ہوں، تاکہ تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچا دوں اور نصیحت کروں، اگر تم میری بات مان لو جو میں لایا ہوں تو تمہارا حصہ ہے دنیا اور آخرت میں، اور اگر رد کر دو تو میں صبر کروں گا یہاں تک کہ اللہ تعالی میرے درمیان اور تمہارے درمیان فیصلہ کر دے"۔ (۱)

"ولید بن مغیرہ نے کہا: اللہ کی قسم اس کے کلام میں مٹھاس ہے اور اس کی اصل بڑی لذت والی ہے، اس کے لیے روشنی ہے، وہ یقینا غالب ہو گا اور کوئی اس پر غالب نہیں آسکتا"۔ (۲)

رسول اللہ ﷺ نے ہدف کو واضح کرنے میں کوئی ذرہ برابر بھی لچک اور ڈھیل سے کام نہیں لیا یہاں تک کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قانون بن گیا جب بھی لوگوں نے اس راستے اور طریق کو چھوڑا تو وہ اصل راستے سے بھٹک گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے معاشرے کی اصلاح کے ہدف کو اس انداز سے پیش کیا کہ دنیا اپنی تمام خوبصورتیوں اور بدصورتیوں کے باوجود رہنے کی جگہ قرار پائی۔

۳۔ حصول ہدف کے لئے صبر و تحمل:

انسانی زندگی میں صبر و تحمل ایک ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ کوئی کام اس وقت تک احسن انداز سے مکمل اور پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا جب تک ان کو لازم نہ بنایا جائے۔ معاشرے کی اصلاح کے لیے اس کی اہمیت سے کیسے انکار کیا جاسکتا ہے کیونکہ دوران اصلاح ہر قدم پر داعی کو صبر و تحمل کی ضرورت پیش آتی ہے۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿وَاتَّبِعْ مَا يُوحَى إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّى يَحْكُمَ اللَّهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ﴾ (۳)

---

(۱) السیرۃ النبویۃ، ابن ہشام، ۱/۲۹۶

(۲) السیرۃ النبویہ، ابن کثیر، ۱/۴۹۹

(۳) سورۃ یونس: ۱۰/۱۰۹

ترجمہ: اور (اے پیغمبر) تم کو جو حکم بھیجا جاتا ہے اس کی پیروی کئے جاؤ اور صبر کرو۔ یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

دوران اصلاح صبر کرنے پر اصرار کی تاکید پر اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ﴾(۱)

ترجمہ: اور صبر ہی کرو اور تمہارا صبر بھی اللہ ہی کی مدد سے ہے اور ان کے بارے میں غم نہ کرو اور جو یہ اندیشی کرتے ہیں اس سے تنگدل نہ ہو۔

مکی عہد میں اسلامی قیادت نے اس بات کو ملحوظ خاطر رکھا کہ معاشرے کی اقدار کو قائم رکھا جائے تاکہ اصلاح معاشرہ کا یہ عمل اپنی اصل شکل میں مکی معاشرے میں اپنا مکمل اثر چھوڑے، اور ایک مسلمان اسلام کی چلتی پھرتی شکل نظر آئے۔

اسی لیے مکی دور میں اسلامی دعوت نے تصادم سے بچتے ہوئے برداشت، تحمل اور صبر کا راستہ اپنایا تاکہ معاشرے میں اسلام کو اپنی حقیقت کو واضح کرنے اور اس دعوت کو قبول کرنے والوں کے لیے اخلاص اور مشکل حالات کا سامنا کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔

((فقال رسول الله ﷺ:صبرا يا آل ياسر، فإن موعدكم الجنة))(۲)

ترجمہ: اے ال یاسر صبر کرو تمہارا ٹھکانہ جنت ہے۔

اگر قرآن پاک مسلمانوں کو اس مرحلے پر اپنے دفاع کی اجازت دے دیتا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ یہ بات واضح کی جاسکتی کہ یہ دعوت انسانیت کی بھلائی اور خیر کی ہے، اس طرح ہر گھر اور خاندان میں لڑائی جھگڑے شروع ہو جاتے اور کافروں کی بات سچ ٹھہرتی کہ محمد ﷺ مرد وعورت، بہن بھائی اور والدین بچوں میں لڑائی کروادی ہے۔ اس اگر مکی سورتوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بخوبی سمجھ آتی ہے کہ قرآن صبر و تحمل اور برداشت کی ترغیب دیتا ہے۔ بلکہ ان کو پہلی قوموں کے ساتھ تقابل کرتا بھی نظر آتا ہے کہ ان پر کیسے حالات رہے اور اس کے باوجود انہوں نے ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا۔

---

(۱) سورۃ النحل:۱۶/ ۲۷

(۲) الحاکم، محمد بن عبد اللہ، محقق: مصطفی عبد القادر عطاء، المستدرک علی الصحیحین، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ط ا، ۱۹۹۰ء، ۳/ ۴۳۲، حدیث ۵۶۴

سید قطب رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں:

''مدد کی وہ صورت جو ایک نفس انسانی خواہش کرتا ہے بلکے وہ اللہ کے حضور جو کہ تصرفات اور بادشاہت کا مالک ہے، اور جو کچھ بھی اس کی طرف سے ہے وہ خیر ہے، وہی واحد ایسی مدد ہے جو خواہشات نفسانی اور شیطان کے اثر سے پاک ہے، یہی وہ داخلی مدد ہے جو کہ خارجی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور اس داخلی مدد کی بنیاد طویل صبر، شدید احتمالات جو کہ خالص اللہ کے لیے ہوں، قرآن مجید اس طرح کے حالات کی مثالیں اس انداز میں ذکر کرتا ہے''۔(۱)

اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿قُتِلَ أَصْحَابُ الْأُخْدُودِ، النَّارِ ذَاتِ الْوَقُودِ، إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُودٌ، وَهُمْ عَلَى مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ، وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ﴾(۲)

ترجمہ: خندقوں والے ہلاک کر دیے گئے، آگ جس میں ایندھن تھا۔ جب کہ وہ ان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور جو (سختیاں) اہل ایمان پر کر رہے تھے ان کو سامنے دیکھ رہے تھے۔

یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کیسے صبر کو جماعت اور اصلاح معاشرہ کی بنیاد بنا کر اولین مسلمانوں کے دلوں میں پختہ کیا گیا۔ کیونکہ یہ دور مدنی دور سے طویل ہے اس لیے اس دور کے تیار شدہ لوگ اپنے عمل سے ثابت کرتے رہے۔ بے شک اسلام انسانوں کی عزت واحترام اور کرامت کا دین ہے یہ تبھی ممکن تھا جب اس کے حامل لوگ اس کا عملی مظاہرہ پیش کریں۔ اسی لیے مکی سورتوں میں صبر کی تلقین مسلسل کی گئی ہے۔

اسی لیے اللہ تعالی نے ہر دور میں داعیوں او راصلاح معاشرہ کے حامل لوگوں کو تربیت کے ایک لمبے اور کٹھن مراحل سے گزارہ بلکہ ان کے اندر یہ خاصیت بھی پیدا کی کہ وہ ہر طرح کے مشکل حالات میں اس عمل پر ثابت قدمی دکھائیں۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿الم، أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لا يُفْتَنُونَ، وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ﴾(۳)

---

(۱) سید قطب، ابراہیم، تفسیر فی ظلال القرآن، دار الشرق، بیروت، ط ۱۷، ۱۴۱۲ھ، ۴/ ۷۹-۸۱

(۲) سورۃ البروج: ۸۵/ ۴-۸

(۳) سورۃ العنکبوت: ۲۹/ ۳-۲۔

ترجمہ: کیا لوگ یہ خیال کئے ہوئے ہیں کہ یہ کہ ہم ایمان لے آئے چھوڑ دیئے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی۔ اور جو لوگ ان سے پہلے ہو چکے ہیں ہم نے ان کو بھی آزمایا تھا سو اللہ ان کو ضرور معلوم کرے گا جو سچے ہیں اور ان کو بھی جو جھوٹے ہیں۔

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اپنی حیات مبارکہ میں قریش کی ہلاکت کی دعا نہ کی باوجود اس کے کہ انہوں نے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اور آپ کے ساتھیوں کو تکلیف پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

حضرت خباب رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ بیان کہتے ہیں: "میں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس آیا اور وہ کعبہ کے سایے میں ایک چادر اوڑھے بیٹھے تھے، اور ہم مشرکین کے ظلم و ستم کا برے طریقے سے شکار تھے۔ میں نے کہا: آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اللہ سے دعا کیوں نہیں کرتے؟ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ٹیک چھوڑ کر بیٹھے اور فرمانے لگے تم سے پہلے لوگوں کو لوہے کی کنگھیوں سے نوچا گیا یہاں تک کہ ان کی ہڈیوں پر گوشت نہ رہا تاکہ ان کو ان کے دین سے ہٹایا جاسکے، کئی لوگوں کے سروں کو درمیان سے آرے کے ذریعے چیر دیا گیا لیکن یہ عمل بھی ان کو دین سے نہ ہٹا سکا، اللہ کی قسم ایک شخص صنعا سے حضر موت تک چلے گا اسے اللہ کے خوف کے علاوہ کوئی خوف نہ ہو گا"۔[۱]

بے شک اسلام کا معاشرے کی اصلاح کا عمل صبر کے منہج سے منسلک ہے اور تحمل کے قانون پر چلتا ہے بے شک صبر جہاد ہے اور جہاد فریضہ ہے کیونکہ صبر جہاد کا ایک رنگ ہے کیونکہ اس میں انسان ہمت او رجوانمردی کے ساتھ شیطان کے وسوسوں کا مقابلہ کرتا ہے۔

مکی دور میں تحریک اسلامی اسی طرح کے جہاد کی محتاج تھی تاکہ تربیت پانے والے صحابہ کرام رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُم کی وہ صلاحیتں بیدار ہو جائیں جو معاشرے پر گہرا اثر چھوڑے اور لوگ باقاعدہ طور پر خود اس کی عملی شکل پیش کریں۔ جیسا کہ خاندانی عصبیت، دنیا کی محبت کے بدلے میں قربانی کا جذبہ دوسروں کے لیے کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔

مکی دور اصل میں تربیت کا زمانہ تھا جو ایک خاص قسم کے مخالفین اور حالات وواقعات پر مشتمل تھا یہ عرب معاشرے کی وہ جاہلی شکل تھی جو کہ آباواجداد کی وراثت کے حامل ہونے کی شکل پیش کر رہا تھا۔ اس لیے تربیت کے اہداف میں یہ بات سر فہرست تھی کہ ان لوگوں کی تربیت ذات کے اعتبار صبر، تحمل، سختیوں میں جوانمری سے مقابلہ کرنا تھا کیونکہ وہ مجموعی طور پر طبیعت کے اعتبار سے ایسے نہیں تھے۔

(۱) فتح الباری، ۸/۱۶۵

۴-بہترین منہج کا انتخاب

معاشرے میں اجتماعی تغیر پیدا کرنے کے لیے لازم ہے کہ اصلاح کے لیے بہترین منہج کی ترتیب دی جائے جو معاشرے کی مبادئیات اور ضروریات کے عین مطابق ہو۔ اسی لیے علوم اجتماعیہ معاشرے میں جماعت کے تصور کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ وہ لوگوں کو بنیادی اور اہم معاملات کی طرف اچھے انداز سے لے کر چلتی ہے ایک بنیادی عنصر کی طرح جس سے معاشرے کی نجات مطلوب ہو۔

منہج مختلف انواع کا ہوتا ہے داعی کے اعتبار سے کبھی جزوی اور کبھی کلی جیسا کہ معاشرے کی فکری اور اجتماعی ضرورت ہو۔ کوئی بھی داعی رسول اللہ ﷺ کے علاوہ انسانی زندگی اور فکر کو مکمل جاننے کا دعوی نہیں کر سکتا چہ جائے کہ اس نے اصلاح کے لیے کوئی بھی طریقہ اختیار کیا ہو۔ رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کار کی تمام لوگوں نے جو کسی بھی فکر و فلسفہ یا رنگ و نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی زندگی کے ابتدائی ایام سے اللہ تعالی سے ملاقات تک تعریف کی۔

اسی لیے اسلام کی تعلیمات اب تمام دنیا میں واضح ہیں اور اس میں کوئی ایسی بات باقی نہیں جو پوشیدہ ہو اور نہ ہی کوئی ایسی جس کی وضاحت کی ضرورت ہو۔ اسی لیے دنیا کو کوئی بھی شخص جو کسی بھی زبان، نسل یا علاقے سے تعلق رکھتا ہو وہ تمام نبی پاک ﷺ کے متعلق جانتے ہیں ان کی ولادت، رضاعت، جوانی، بعثت اور ان کی اللہ تعالی سے ملاقات تک تاریخی اور حوداث کے اعتبار سے جبکہ اس کے علاوہ جتنے بھی لوگ چاہے وہ آسمانی ادیان سے منسلک ہیں یا انسانی ان کو پیش کرنے والوں کی زندگی ان کے ماننے والوں سے ناپید ہیں۔ وہ موسیٰ اور عیسیٰ یا اسی طرح سقراط یا زرتشت یا گورونانک ہوں۔[1]

عرب کی ثقافت بہت ساری ثقافتوں کے مجموعہ تھی اس کے لیے رسول اللہ ﷺ نے جو اسلوب اور منہج اختیار کیا وہ انتہائی پسندیدہ اور اثر پذیر تھا۔ خاص طور پر جب ان لوگوں کے لیے بالکل نیا تصور پیش کرنا تھا عقیدہ، اخلاق، معاملات کے حوالے سے اور اس سب کو پیش کرنے کے لیے آپ نے تدرج اور بہترین اسلوب کو اختیار کیا۔

ولید بن مغیرۃ نے قریش کو کہا کہ حج کا موسم شروع ہونے والا ہے اور تمہارا ساتھی محمد ﷺ لوگوں سے اپنی بات کرے گا اس لیے تم کو چاہیے کہ اس کے بارے میں متفق فیصلہ کر لو تا کہ تم اس کے بارے میں کسی طرح کی متضاد باتوں کے شکار نہ ہو، ولید کہنے لگا اللہ کی قسم اس کے کلام میں مٹھاس ہے تم جو کچھ بھی کہو گے وہ باطل ہو گا، جو

(۱) ندوی، سید سلیمان، الرسالۃ المحمدیۃ، دار ابن کثیر، دمشق، ۱۴۲۳ھ، ص:۵۹-۶۳

بات مجھے اس سب سے قریب تر لگتی ہے یہ کہ تم کہو کہ یہ جادو گر ہے۔ اسکا جادو مرد وعورت، بہن بھائی، شوہر بیوی، دوست اور رشتہ داروں میں تفریق ڈال دیتا ہے۔[۱]

یہ منہج کی سب سے عمیق شکل ہے کہ قریش مکہ کے دلوں میں متفقہ طور پر رسول اللہ ﷺ کا رعب اس حد تک بیٹھ چکا تھا کہ وہ نبی پاک ﷺ کے بارے میں غور فکر کرتے رہتے۔

ضماد مکہ آیا جو کہ دم کیا کرتا تھا اور بے وقوف لوگ اس کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے۔ اسے لوگوں نے بتایا کہ محمد ﷺ (نعوذ باللہ) پاگل ہیں، وہ آیا اور کہنے لگا میں اسے دم کروں گا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالی میرے ہاتھ سے اس کو شفا دے۔ وہ شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرے دم سے شفایاب ہو جاؤ گے۔ ضماد کہنے لگا: اللہ کی قسم میں نے بہت سے کاہنوں، جادو گروں اور شرک کرنے والوں کا کلام سنا ہے لیکن ایسا کلام پہلے کبھی نہیں سنا۔ یہ کلمات اپنے اندر ایک بہت گہرا سمندر رکھتے ہیں آپ اپنا ہاتھ بڑھائیے میں آپ کے ہاتھ پر اسلام کے لیے
بیعت کرتا ہوں۔[۲]

ابو جہل اور اس کے ٹولے نے تمام حدود کو کراس کیا جو اس دعوت اور اس سے تیار ہونے والے لوگوں کے خلاف کیا جاسکتا تھا، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس کوشش کو خالص اللہ تعالی کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق روحانیت سے بھرپور پیش کیا مکہ اور اس کے ارد گرد کے علاقوں میں، اسی بات کو اگر مد نظر رکھا جائے تو یہ بات آسانی سے سمجھ آتی ہے کہ عرب کے دیگر علاقوں میں یہ دعوت زیادہ موثر اور تیزی سے اثر انداز ہوئی مکہ کے مقابلے میں کیونکہ یہاں رہنے والے لوگوں کے دل انتہائی سخت، جہالت سے بھرے، آنکھوں سے اندھے، کانوں سے بہرے اور دلوں کے پتھر دل تھے۔

اس کے باوجود کہ وہ اتنے زیادہ سخت دل تھے سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ ابو سفیان، ابو جہل، اخنس بن شریق رات کے اندھیرے میں رسول اللہ ﷺ کا قرآن مجید کی تلاوت کرنا سننے کے لیے نکلا کرتے تھے۔ اخنس ابو جہل کے پاس آیا اور اس کے گھر میں داخل ہوا اور اس سے کہا: اے ابو الحکم تمہاری کیا رائے ہے جو تم نے محمد ﷺ سے سنا ہے۔ اس نے کہا ہمارا اور عبد مناف کا آپس میں جھگڑا ہے انہوں نے کھلایا تو ہم نے بھی کھلایا انہوں نے عطا کیا تو ہم نے بھی عطا کیا۔ یہاں تک کہ وہ اور ہم برابر ہو گئے اب وہ کہتے ہیں ہم میں نبی آیا ہے جس کے پاس آسمان سے وحی

---

(۱) السیرۃ النبویہ، ابن ہشام، ۱/ ۲۷۰

(۲) السیرۃ النبویہ، ابن کثیر، ۱/ ۴۵۳

آتی ہے اب ہم اس جیسا کہاں سے لائیں، اللہ کی قسم ہم اس پر کبھی بھی ایمان نہیں لائیں گے اور نہ ہی اس کی تصدیق کریں گے اخنس اس کے پاس سے کھڑا ہوا اور اس کو اسی حال میں چھوڑ دیا۔[۱]

رسول اللہ ﷺ کے اسلوب اور بہترین منہج کا اندازہ صرف اس بات سے ہو جاتا ہے کہ کفار کے بڑے سردار جو کہ اسلام کے ازلی دشمن تھے وہ اندرونی طور پر اسلام کے حقانیت کے قائل تھے لیکن قبائل عصبیت کی وجہ سے اس کو قبول کرنے سے انکاری تھے۔ انہوں نے جب تک کفر پر باقاعدہ عہد نہیں لیا اس وقت تک وہ اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کی تلاوت سننے سے باز نہ رکھ سکے۔

ہم یہ بات برملا کہہ سکتے ہیں کہ صرف رسول اللہ ﷺ کی ذات ہی وہ اکمل ذات ہے جس نے انسانوں کو فکری، اجتماعی اور اصلاحی حیثیت سے اس طرح سانچے میں ڈھالا کہ ان کے مخالفین ہزار مخالفت کے باوجود اس کی روحانیت کو نہ صرف حاصل کرتے بلکہ دل سے اس کے حق ہونے کا اقرار بھی کرتے۔

یہی وہ جنگ تھی جو تمام قبائل اور جزیرۃ العرب کے اندر پھیلی ہوئی تھی اور جو گزرتے سالوں کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔ اس خطرہ سے آگاہ کرنے کے لیے وہ لوگ حج کے موسم میں راستے میں بیٹھتے اور ہر گزرنے والے کو اس سے آگاہ کرتے، نتائج سے ڈراتے اسی طرح نبی پاک ﷺ کے بارے میں خبر تمام عرب کے اندر پھیلی کہ یہی وہ شخص ہے جو اس دعوت کا حامل ہے۔

((قَالَ أَبُو ذَرٍّ:فَقَالَ أُنَيْسٌ: إِنَّ لِي حَاجَةً بِمَكَّةَ فَاكْفِنِي، فَانْطَلَقَ أُنَيْسٌ حَتَّى أَتَى مَكَّةَ، فَرَاثَ عَلَيَّ، ثُمَّ جَاءَ فَقُلْتُ: مَا صَنَعْتَ؟ قَالَ: لَقِيتُ رَجُلًا بِمَكَّةَ عَلَى دِينِكَ، يَزْعُمُ أَنَّ اللهَ أَرْسَلَهُ، قُلْتُ: فَمَا يَقُولُ النَّاسُ؟ قَالَ: يَقُولُونَ: شَاعِرٌ، كَاهِنٌ، سَاحِرٌ، وَكَانَ أُنَيْسٌ أَحَدَ الشُّعَرَاءِ. قَالَ أُنَيْسٌ: لَقَدْ سَمِعْتُ قَوْلَ الْكَهَنَةِ، فَمَا هُوَ بِقَوْلِهِمْ، وَلَقَدْ وَضَعْتُ قَوْلَهُ عَلَى أَقْرَاءِ الشِّعْرِ، فَمَا يَلْتَئِمُ عَلَى لِسَانِ أَحَدٍ بَعْدِي أَنَّهُ شِعْرٌ، وَاللهِ إِنَّهُ لَصَادِقٌ، وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ))[۲]

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں، میر ابھائی انیس مکہ گیا پھر میرے پاس آیا اور کہنے لگا، میں مکہ میں ایک ایسے شخص سے ملا ہو جس کا یہ خیال ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے اور اس کو بھیجا گیا ہے، میں نے پوچھا: لوگ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ اس نے کہا: وہ کہتے ہیں وہ شاعر، جادوگر،

(۱) ایضا:۱/۵۰۶

(۲) القشیری، مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، باب من فضائل ابی ذر، دار إحیاء التراث العربی، بیروت، دار البشیر، طنطا، ۱۹۹۹ء، حدیث ۲۴۷۳: ۴/ ۱۹۱۹

کاہن ہے اور انیس خود شعراء میں شمار ہوتا تھا۔ اس نے کہا: میں نے کاہنوں کے کلام سنے ہیں وہ ان جیسا کلام نہیں ہے، اس کو شاعر کہتے ہیں اللہ کی قسم کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ شعر کہتا ہے، اللہ کی قسم وہ سچا ہے اور وہ سب جھوٹے ہیں۔

قریش کے اس پراپگنڈے نے اس منہج کی توسیع میں بڑی مدد دی، لوگ فطری طور پر سوچنے پر مجبور ہو جاتے جو کہ قریش کی ان باتوں سے کافی دور تھے۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ کا یہ اسلوب انسانی فکر کو سوچ وبچار اور اندھی تقلید سے باہر نکلنے کی کھلی دعوت تھی تاکہ لوگ ابوجہل، ولید بن مغیرہ، عتبہ، ابوسفیان اور اخنس بن شریق کی جہالت سے نکل کر سوچ سکیں۔

نضر بن حارث، ابوجہل اور ولید نے اس بات کا اقرار کیا کہ محمد ﷺ جو کلام پیش کر رہے ہیں وہ انسانوں کا کلام نہیں ہے اور نہ ہی وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے آپ کو ایمان کی دولت سے محروم رکھنے کے لیے اپنے دل اور کانوں کو نور ایمان سے منور ہونے کے لیے بند کر دیا لیکن وہ اس موقف کی تائید اور اس کو پورے عرب میں نشر کرنے کے لیے جو ہتھکنڈے اختیار کیے وہ ان کے معاشرے کے دور اور قریب میں بڑی تیزی سے پھیلا۔

"ابو قیس بن الأسلت جو کہ بنی واقف کا بھائی تھا، وہ قریش سے بہت زیادہ محبت رکھتا تھا اس نے ایک قصیدہ لکھا اس میں ان کی حرمت اور ان کو جنگ سے روکنے اور ان کے اخلاق اور فضائل کا ذکر کیا۔ اسی میں اس نے اس بات کا بھی ذکر کیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے معاملے میں اپنے آپ کو باز رکھیں، اور ان کے ان معبودوں کا ذکر کیا جو اللہ کے علاوہ ہیں اور ان سے اصحاب فیل کو روکے رکھا"۔[1]

اس طرح معاشرے میں رسول اللہ ﷺ کی اصلاح کی جدوجہد نے جو معاشرے پر منہج کے اثرات مرتب کیے اس کا دائرہ کار کافی بڑا اور وسیع تھا۔ اسلامی دعوت کے اصلاحی پہلو کا یہ امتیاز ان امتیازات میں سے ایک ہے جو خالص اللہ تعالی کے لیے ہو تو مدد وہاں سے آتی ہے جہاں سے اس کے وہم گمان بھی نہیں ہوتا۔

۵- قیادت کی تیاری

معاشرے میں رہتے ہوئے نئی قیادت کو تیار کرنا نئی سوچ اور فکر دیتے ہوئے ایک مشکل اور خطرات سے گھرا ہوا عمل ہے۔ اس کام کے لیے آپ نے دار ارقم[2] کو پہلا مرکز بنایا۔ جو لوگ بھی رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو

---

(۱) السہیلی، عبد الرحمن بن عبد اللہ، الروض الأنف فی شرح السیرۃ النبویۃ، دار الکتب الحدیثیہ، ۱۳۸۷ھ، ۳/۱۴۹

(۲) حضرت ارقم رضی اللہ عنہ بن ابی ارقم کا تعلق بنو مخزوم سے تھا۔ بنو مخزوم کا قبیلہ اور بنو ہاشم، جو رسول اللہ ﷺ کا قبیلہ تھا، دونوں ہمیشہ آپس میں برسرپیکار رہے تھے، لہذا کسی کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ ارقم کا گھر مرکز اسلام بن سکتا ہے۔ یہ تو دشمن کے دل میں اپنا قلعہ بنانے والی بات تھی (کہ بنو ہاشم اپنے مخالفین بنو مخزوم کے کسی گھر کو اپنا مرکز بنالیں) حضرت ارقم رضی اللہ عنہ

قبول کرتے ان کو اس مرکز میں تربیت دی جاتی اور ان سے بیعت لی جاتی۔ نئی تربیت کی تیاری کے سلسلے میں آپ نے جس بات کو سب سے زیادہ ملحوظ خاطر رکھا وہ یہی تھی کہ آپ نے ان لوگوں کو ہدف بنایا جو جاہلیت کے معاشرے میں بھی فطرت سلیمہ کے مالک تھے۔ آپ جس شخص کو متعین کرتے اس کو معاشرے میں موجود ناانصافی اور انار کی کی طرف توجہ دلاتے اور پھر اس کو اسلام کے مبادی سیکھلاتے اس طرح اس سے جہالت کے اندھیرے آہستہ آہستہ دور ہوتے چلے جاتے اور اسلام کا نور اس کے دل میں گھر کرتا جاتا۔

ابن ہشام رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

> "اس طرح اسلام مکہ کے مردوں اور عورتوں میں آہستہ آہستہ پھیلنے لگا اور لوگ اس نئے دین کے بارے میں گفتگو کرنے لگے، پھر اللہ تعالی نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو اس بات کا حکم دے جس کا اسے حکم دیا گیا ہے"۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کی اس اعتبار سے تربیت کی کہ وہ لوگ نفسانی، وجدانی، مالی اور اقتصادی حوالے سے بہت زیادہ مضبوط اعصاب کے مالک تھے اور کسی بھی اعتبار سے لوگوں سے نہ جلدی متاثر ہوتے اور نہ کسی سے مرعوب ہوتے۔ رسول اللہ ﷺ جو کہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اصلاح معاشرہ کا کام شروع کیا اس لیے انہوں نے قیادت کی تربیت بھی اسی انداز سے کی کہ فکری طور پر عقیدے کو صحیح اور مکمل سمجھنے والے تھے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے جس ماحول میں کام کا آغاز کیا وہ تن تنہا اور مخالفت سے بھرپور تھا اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ لوگ بھی ایسے حالات وواقعات کا احسن مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

جبکہ اگر ان کے وجدانی یا ایمانی کیفیت کا اندازہ کرنا ہو تو صرف حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا کردار ہی مشعل راہ اور مثال کافی ہے کہ جب انہوں نے اسلام قبول کیا اس وقت ان کی عمر ۱۹ سال تھی اور وہ دوبارہ کفر اختیار کرنے کو انتہائی ناپسند کرتے تھے۔ ان کی والدہ نے ان سے کہا کہ اگر وہ اسلام کو نہیں چھوڑیں گے تو وہ نہ کھائیں گی، نہ پییں گی یہاں تک کہ لوگ ان کو طعنہ دیں گے کہ اس کی والدہ اس کی وجہ سے فوت ہوئی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی

نے جب اسلام قبول کیا تو ان کی عمر اس وقت تقریبا سولہ (۱۶) سال تھی۔ اور قریش کا ذہن اس جانب گیا ہی نہیں کہ ایک نو عمر کا گھر بھی اسلامی مرکز بن سکتا ہے۔ اور ان کا غالب یہی تھا کہ یہ لوگ بنو ہاشم کے کسی گھر کو اپنا مرکز بنائیں گے یا پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ یا ان جیسے کسی اور مسلمان کا گھر مرکز اجتماعات قرار پائے گا (ڈاکٹر منیر محمد الغضبان، المنہج الحرکی للسیرۃ النبویۃ، مکتبۃ المنار الاردن، ط ۲، ۱۹۹۰ء، ۱/ ۴۹)

(۱) السیرۃ النبویہ، ابن ہشام، ۱/ ۲۶۲

والدہ سے فرمایا: خوب اچھی طرح جان لو اگر تمہاری ۱۰۰ جانیں ہوں اور تم ایک ایک کر کے اس لیے قربان کر دو کہ میں رسول اللہ ﷺ کا دین چھوڑ دوں تو بھی ممکن نہیں، چاہیے تم کھاؤ اور پیو اور چاہو تو نہ کرو۔[۱]

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی دینی حمیت اتنی زیادہ بڑھی ہوئی تھی کہ تاریخ اسلام میں سب سے پہلے مشرک کو قتل کرنے والے صحابی ہیں۔[۲]

اصلاح کرتے ہوئے یہ بات انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ جن لوگوں کو اس عمل کے لیے تیار کیا جا رہا ہے ان کی تربیت اس نہج پر کی جائے کہ وہ دنیا کی زیب وزینت سے بے رغبتی برتیں اور اللہ تعالیٰ سے رغبت رکھیں۔ اور یہ خصوصیت دار ارقم میں تربیت پانے والے صحابہ کرام میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ابو ذر رضی اللہ عنہ سے پوچھا جب وہ دور کے علاقے سے تشریف لائے اسلام کے بارے میں جاننے کے لیے اور وہ اس امر کے متعلق قریش مکہ سے بھی نہیں بات کر سکتے تھے انہوں نے اسی حالت میں مکہ میں کتنی راتیں گزاریں، جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے پوچھا: کون تمھیں کھانا کھلاتا تھا؟ تو ابو ذر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا میں زمزم کے پانی پر گزارہ کرتا رہا ہوں۔[۳]

یہ سوال ایک خاص منہج پر قیادت کی تیاری کو بیان کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس مرحلے میں جو لوگ اصلاح معاشرہ کے لیے منتخب فرمائے اور ان کو اس کے مطابق تربیت دی، ان کے معاملے کو انتہائی خفیہ رکھا۔

اصلاح کرتے ہوئے یہ بات انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ جن لوگوں کو اس عمل کے لیے تیار کیا جا رہا ہے ان کی تربیت اس نہج پر کی جائے کہ وہ دنیا کی زیب وزینت سے بے رغبتی برتیں اور اللہ تعالیٰ سے رغبت رکھیں۔

۶- معاشرتی اقدار کا لحاظ

رسول اللہ ﷺ نے عرب کے معاشرے میں اصلاح کے عمل کے لیے معاشرتی اقدار کا نہ صرف تحفظ کیا بلکہ آپ ﷺ نے ان کو اس عمل میں انتہائی اچھے طریقے سے استعمال کیا کیونکہ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ جس معاشرے میں رہتا ہے اس کے اقدار کے تحفظ کی بھرپور کوشش کرتا ہے، اسی لیے اسلام ان تمام اقدار کو اسی طرح سے معاشرے کا حصہ بنا رہنے سے منع نہیں کرتا جو اسلام کے بنیادی عقائد سے مخالفت نہ رکھتا ہو۔

(۱) روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، ۱۹/ ۱۳۹

(۲) الطبری، محمد بن جریر، تاریخ الطبری، دار التراث، بیروت، ط ۱، ۱۳۸۷ھ، ۲/ ۳۱۸

(۳) الحلبی، علی بن ابراہیم بن احمد، السیرۃ الحلبیۃ، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ط ۲، ۱۴۲۷، ۱/ ۳۱۵

عتبۃ نے آپ ﷺ سے کہا کہ اگر تمہیں مال کی چاہت ہے تو ہم تمھارے لیے اتنا مال جمع کرتے ہیں کہ تم قریش کے سب سے غنی انسان کہلاؤ گے اگر تم خوبصورت عورت سے شادی کرنا چاہتے ہو تو ہم تمہارے لیے قریش کی دس خوبصورت عورتیں پیش کرتے ہیں تم ان سے شادی کرلو۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی بات کا جواب دینے کے لیے بڑے ادب واحترام سے کہا کیا تم نے اباولید اپنی بات مکمل کرلی ہے۔(۱)

حضرت مغیرۃ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"إن اول يَوْم عرفنَا رَسُول الله ﷺ أَنِّي امشي أَنا وَأَبُو جهل بن هِشَام فِي بعض أَزِقَّة مَكَّة إِذْ لَقينَا رَسُول الله ﷺ فَقَالَ رَسُول الله ﷺ لأبي جهل يَا ابا الحكم هَلُمَّ إِلَى الله وَإِلَى رَسُوله أَدْعُوك إِلَى الله"(۲)

ترجمہ: میں نے سب سے پہلے جس دن رسول اللہ ﷺ کو جانا، اس دن میں اور ابو جہل مکہ میں جارہے تھے کہ ہماری ملاقات آپ ﷺ سے ہوئی، آپ ﷺ نے ابوجہل کو اس کی کنیت سے پکارتے ہوئے کہا: اے اباالحکم اللہ اوراس کے رسول کی طرف آؤ، میں تم کو اللہ کی طرف پکارتا ہوں۔

عربوں کے نزدیک یہ بات قابل عزت اورنہایت احترام کے سمجھی جاتی تھی اگر کوئی کسی دوسرے کو مخاطب کرتے ہوئے اس کی کنیت سے پکارتا۔ یہاں آپ ﷺ نے یہ اصول سیکھایاہے کہ ایک داعی کے لیے لازم ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ معاشرتی اقدار کا پاس کرتے ہوئے گفتگو کرے۔

خلاصہ بحث:

نبی کریم ﷺ نے مکہ میں اصلاح معاشرہ کے لیے جو منہج اختیار کیا وہ پرامن، تدریجی، تربیتی اور مستحکم بنیادوں پر تھا۔ آپ ﷺ کی کوشش معاشرے میں فساد کو اصلاح کے ساتھ بدلنے کی تھی جس کے ذریعے لوگوں کو اصل نصب العین کی طرف بلاتے اور وقتی طور پر معاشرے کے مروجہ ڈھانچے کے اندر رہ کر اصلاح کی دعوت دیتے۔اسی لیے آپ کے اس عمل میں جبر وتشدد کا شائبہ بھی نہ تھا۔ آپ ﷺ لوگوں کے ایک ایک سوال اور اعتراض کا بڑے بہترین انداز سے جواب دیتے جو کہ لوگوں کو افہام وتفہیم پر مجبور کرتا۔ یہ اسی منہج کا نتیجہ تھا کہ آپ کی ۱۳ سالہ مکی جدوجہد سے وہ انقلاب برپا ہوا جس نے معاشرے کا نقشہ بدل دیا۔اس ساری کوشش کے دوران آپ ﷺ نے صبر وتحمل، جرأت، عزیمت، استقامت اور اخلاق وکرادر کو اپنا راستہ بنائے رکھا۔

---

(۱) السیرۃ النبویہ، ابن کثیر، ۱/۵۰۴

(۲) السیوطی، عبد الرحمن بن ابی بکر، الخصائص الکبری، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱/۲۸۶

آپ ﷺ کا مکی اصلاح منہج آج کے ان داعیوں کے لیے مشعل راہ ہے جو دنیا کے ایسے علاقوں میں آباد ہیں جہاں مسلمان زیر تسلط ہیں یا مسلمانوں کا عرصہ حیات کسی بھی طرح سے تنگ کر دیا گیا ہے کہ وہ کس طریقے سے ان علاقوں، قوموں اور آبادیوں میں نہ صرف اپنے اسلام کو بچا سکتے ہیں بلکہ وہ اسلام کی ترویج واشاعت کا بڑے اچھے طریقے سے سبب بن سکتے ہیں۔

اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ یہ مشکلوں، تکلیفوں اور صبر و تحمل کا راستہ ہے لیکن تربیتی عمل کے دوران حکمت سے کام لیا جائے۔ لیکن یہ سوچنا بھی غلط ہو گا کہ اصلاحی وتربیتی عمل میں حکمت سے مراد اصل سے پیچھے ہٹنا ہے۔ بلکہ اس کا اصل مقصد ایسے ذرائع اختیار کرنا ہے جو لوگوں کی عقلوں اور ذہنوں کو زیادہ اپیل کر سکیں تا کہ ہدف تک آسانی سے پہنچا جا سکے۔ اس کے ساتھ کسی مصلح کو یہ حق حاصل نہیں کہ حکمت کے نام پر اسلام کے احکام، اصولوں میں تبدیلی کر دے اور حدود سے تجاوز یا ان پابندیوں کا خیال نہ رکھا جائے جس کا حکم دیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے مکی عہد میں قریش مکہ کے ہر طرح کے حربے اور اذیت کے باوجود اس بات کو بڑے اچھے انداز میں تمام آنے والے مصلحین اور داعیوں کے سامنے پیش کیا ہے۔